احکامِ شرعیہ میں عرف وعادت کے اطلاق کا ایک مطالعہ

A Study of the Application of Custom and Usage in Shariah Injunctions

ڈاکٹر حافظ عبدالغنی[i] فیصل محمود[ii]

Abstract:

In every legal system in the world, some elementary principles are formulated by the experts or legislature which work as the sources of law and recognized by jurists. Some legal rules, however, are not laid down by the legislature or experts but grow instead from informal social practices.

These are known as customs and usages in legal terms. Custom is a matter on which a community of people agrees in the course of their daily life, and common usage is an action which is repeatedly performed by individuals and communities. When a community makes a habit of doing something, it becomes its common usage. The custom or common usage of a community shares the same underlying idea even if what is understood by them differs slightly.

In contract law, for example, the customs of merchants are used by the courts to interpret the provisions of business contracts; in tort law, customs of best practice are used by courts to define professional responsibility.

This article studies custom and usage as a source of Islamic Fiqh and its application in Shariah Law.

Keywords: *Custom, usage, jurisprudence, law, injunctions*

عرف وعادت دو مختلف فنی اصطلاحات ہیں جو اپنے لغوی اور فقہی مفہوم میں تنوع اور نظری تصور میں اختلاف کے باوجود اپنے عملی اطلاق میں ایک لحاظ سے ترادف و یکسانیت کی حامل ہیں تاہم دوسرے اعتبار سے باہم عموم و خصوص مطلق کی نسبت بھی رکھتی ہیں، کیونکہ عادت کا مفہوم اتنا وسیع اور عام ہے کہ اِس میں عرف کی تقریباً ہر صورت شامل ہے۔ عرف سے مراد وہ عمل ہے جس پر لوگ بلا جبر واکراہ متفق ہو جائیں اور عادت افراد و جماعت کے بار بار عمل کا نام ہے۔ جب کوئی جماعت کسی عمل کی عادی ہو جائے تو وہ ان کا عرف اور رسم و رواج بن جاتا ہے۔ زیرِ نظر مقالہ " احکامِ شرعیہ میں عرف و عادت کے اطلاق کا ایک مطالعہ "مختلف ذیلی مباحث کے تحت پایہ تکمیل کو پہنچایا گیا ہے۔

عرف وعادت کا مفہوم

عَرَفَ یَعرِفُ عِرفَاناً کا لغوی معنی-"جاننا پہچاننا" ہے اور اِسی سے معرفت آتا ہے جیسا کہ امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں

"المعرفة والعرفان إدراك الشيء بتفكر و تدبر لأثره[1]"

---

i ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ مطالعہ مذہب، ایف سی کالج یونیورسٹی، لاہور

ii ایم فل ریسرچ سکالر، شعبہ علوم اسلامیہ، عبدالولی خان یونیورسٹی، مردان

"معرفت اور عرفان یعنی کسی شی کو اُس کے اثر کی وجہ سے خوب غور و فکر کے ساتھ جان لینے کا نام ہے۔"

عرف اور معروف کے الفاظ پسندیدہ افعال کے لیے استعمال ہوتے ہیں جیسا کہ لسان العرب میں ہے:

"العرف : هو كل ما تعرفه النفوس من الخير و تَبْسَأ به و تطمئن إليه، و المعروف: ما يستحسن من الأفعال[2]"

"عرف سے مراد وہ تمام اعمالِ خیر ہیں جن سے نفس انسانی شناسا اور مطمئن ہو جائے اور معروف پسندیدہ افعال کو کہتے ہیں"

چنانچہ عرف اور معروف ہر وہ بات ہے جسے نفس انسانی اچھا سمجھے اور عقل و شریعت کی میزان میں بھی وہ پسندیدہ ہو جیسا کہ امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں:

"المعروف: اسم لكل فعل يعرف بالعقل أو الشرع حسنه[3]"

"معروف ہر اُس چیز کا نام ہے جس کی خوبی عقل یا شریعت کے باعث پسند کی جائے"

فقہاء اور اصولیین سے عرف کے مفہوم کے بارے میں حسب ذیل اہم اور بنیادی تعبیرات منقول ہیں:

ابن عابدینؒ شامی اپنے "رسالة نشر العرف في بناء بعض الأحكام على العرف" میں عرف کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"العادة والعرف: ما استقر في النفوس من جهة العقول و تلقته الطباع السليمة بالقبول[4]"

"عرف و عادت وہ ہے جو نفوس میں عقلی اعتبار سے راسخ ہو چکی ہو اور نیک طبیعتیں اُس کو قبول کر لیں"

امام جرجانیؒ عرف کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"العرف: ما استقرت النفوس عليه بشهادة العقول و تلقته الطباع السليمة بالقبول[5]"

"عرف وہ ہے جو عقلی شہادت پر دلوں میں قرار پکڑے اور سلیم (درست) طبیعتوں نے اُس کو بخوشی قبول کر لیا ہو"

وضعی قانون میں عرف و عادت کو رسم و رواج کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ وہ عمل ہے جسے لوگوں نے عام طور پر برضا و رغبت قبول کر لیا ہو۔ اِس پر جب ایک لمبے عرصے سے غیر متبدل عادت کے طور پر عمل ہوتا رہا ہو تو ایسی عادت ایک قانونی قوت کی حامل ہو جاتی ہے۔ وضعی قانون میں اس کے لئے ایک ترکیب "Custom and Usage" استعمال ہوتی ہے اور یہ وہ عمومی رواج اور تعامل ہوتے ہیں جو عام طور پر مشترکہ عادت کے باعث قبول کر لیے گیے ہوں۔

عرف وعادت کا باہمی تعلق

فقہاء نے عرف و عادت کے باہمی تعلق کو بھی واضح کیا ہے۔ فقہاء کرام کی عبارات کو سامنے رکھتے ہوئے درج ذیل آراء سامنے آتی ہیں:

ایک رائے یہ ہے کہ عرف و عادت کے درمیان ترادف کا تعلق ہے یعنی گو کہ الفاظ الگ الگ ہیں لیکن دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے، جیسا کہ استاذ احمد فہمیؒ نے دونوں کی ایک ہی تعریف کی ہے:

"العادة و العرف ما استقر في النفوس و تلقته الطباع السليمة بالقبول[6]"

"عرف و عادت وہ عمل ہے جو نفوس میں راسخ ہو جائے اور سلیم الطبع لوگوں کے لیے قابل قبول ہو"

عبدالوہاب خلاف کے خیال میں بھی عرف و عادت ایک ہی چیز کے دو الگ الگ نام ہیں:

"العرف و العادة فی لسان الشرعیین لفظان مترادفان معناهما واحد[7]"

"عرف وعادت ماہرین شریعت کی زبان میں دو مترادف الفاظ ہیں جن کا ایک ہی معنی ہے"

ایک دوسری رائے کے مطابق ان کے اطلاقات میں قدرے فرق ہے چنانچہ عرف اقوال کے ساتھ مخصوص ہے اور عادت افعال کے ساتھ؛ چنانچہ عبدالعزیز بخاری کا کہنا ہے:

"ویجوز أن یکون الاستعمال راجعا إلی القول... و العادة راجعة إلی الفعل[8]"

"اور درست ہے کہ عرف کا استعمال اقوال کی طرف لوٹتا ہے۔۔۔اور عادت عمل کی طرف لوٹتی ہے"

اُصولیین کی تیسری رائے یہ ہے کہ عرف وعادت کے درمیان عموم وخصوص مطلق کی نسبت پائی جاتی ہے۔ عادت عرف سے مطلقاً عام ہے۔ یعنی ہر عرف کو عادت کہہ سکتے ہیں لیکن ہر عادت کو عرف نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہر عادت عرف نہیں ہوا کرتی۔ اُستاذ مصطفی الزرقاء عرف وعادت کے درمیان نسبت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فتکون النسبة بین العادة و العرف هي العموم و الخصوص المطلق لأن العادة أعم مطلقاً أبدًا، والعرف أخص[9]"

"عرف وعادت کے درمیان عموم وخصوص مطلق کی نسبت پائی جاتی ہے کیونکہ عادت ہمیشہ عام ہے جبکہ عرف خاص ہے"

احکامِ شرعیہ میں عرف وعادت کے اطلاقات کا جائزہ

عرف وعادت اور رسم ورواج کو ہمیشہ سے قانون سازی کا مأخذ ہونے کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ بالخصوص قدیم ادوار میں عرف ورواج ہی قانون کی اساس ہوا کرتا تھا اور اسی رسم ورواج سے معاشرے کی مختلف صورتیں پیدا ہوتی گئیں چنانچہ یہی عرف وعادت اور رسم ورواج مذہب، اخلاق اور بہت سے دنیاوی معاملات کی بنیاد بنے۔ اگرچہ عدالتوں کے قیام اور قوانین کی تدوین کے بعد عرف وعادت کی قانونی حیثیت میں کچھ فرق پڑا ہے تاہم اب بھی قانون سازی کے عمل میں عرف وعادت کی رعایت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔

فقہاء اور مفسرین نے قرآن مجید کی درج ذیل آیت سے عرف کے معتبر ہونے کی دلیل پکڑی ہے:

"وَأۡمُرۡ بِالۡعُرۡفِ وَأَعۡرِضۡ عَنِ ٱلۡجَٰهِلِينَ[10]"

"اور معروف کی تلقین کیے جاؤ اور جاہلوں سے نہ اُلجھو"

امام رازیؒ اِس آیت کی تفسیر کے تحت لکھتے ہیں:

"هو کل أمر عرف أنه لا بد من الإتیان به و أن وجوده خیر من عدمه[11]"

"معروف ہر وہ امر ہے جس کا انجام دینا ضروری اور اُس کا وجود اس کے عدم سے بہتر ہوتا ہے"

مختصر یہ کہ قرآن مجید کی وہ آیات جن میں لفظ "معروف" یا "المعروف" آیا ہے وہ تمام آیات عرف کے معتبر ہونے کی گواہی دیتی ہیں۔ قرآن مجید کے بعد عرف کی حجیت پر جو دلیل سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ آپ ﷺ کی یہ روایت ہے:

"فما رآه المسلمون حسنًا فهو عند الله حسن، وما رآه المسلمون قبیحًا فهو عند الله قبیح[12]"

"پس جس عمل کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے اور جسے مسلمان بُرا سمجھیں وہ اس کے نزدیک بھی بُرا ہے"

فقہاء کی کثیر تعداد نے اِس حدیث کو اجماع، استحسان اور عرف کی حجیت کے لئے بطور دلیل پیش کیا ہے۔ جیسا کہ ابن نجیمؒ اپنی کتاب الاشباہ والنظائر میں مشہور فقہی قاعدے "العادۃ محکمۃ" کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وأصلها قوله: ما رآه المسلمون حسنًا فهو عند الله حَسَنٌ[13]"

"اِس قاعدہ کی بنیاد آپ ﷺ وسلم کے اِس ارشاد پر ہے: جسے مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے

ابن ہمامؒ نے حجیتِ عرف پر بحث کرتے ہوئے اِسی ارشاد کو نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"والعرف إنما صار حجة بالنص، وهو قوله: ما رآه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن[14]"

"عرف نص کی بدولت حجت بن گیا ہے اور وہ نص آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ جسے مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے"

فقہ اسلامی اپنے مآخذ اور ان کی ترتیب کے اعتبار سے بے مثل قانون ہے۔ قرآن وسنت شریعت اسلامیہ کے بنیادی مآخذ ہیں جب کہ دیگر کئی ایک ایسے مآخذ ہیں جو ثانوی حیثیت کے حامل ہیں[15]۔

"عرف وعادت" کو بہت سے فقہاء اور قانون دان شریعت کے ثانوی مآخذ میں شامل کرتے ہیں۔ چنانچہ فقہ اسلامی میں عرف وعادت، استحسان بالعرف اور استحسان بالضرورت کی اصطلاحات عام ہو چکی ہیں البتہ بعض اسے استنباطِ احکام کے لئے محض ایک معاون وسیلہ کا درجہ دیتے ہیں۔ اس سے بعض اوقات یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید "عرف وعادت" کی بطور مأخذ قانون کوئی جداگانہ حیثیت نہیں ہے حالانکہ اسلامی قانون سازی کے عمل میں "عرف وعادت" کا مطالعہ ہمیشہ سے ایک اہم موضوع رہا ہے۔ معاصر فقہاء اور قانون دان بھی جدید فقہی اور قانونی مسائل کے حل اور قانون سازی کے عمل میں عرف وعادت کو خصوصی اہمیت دیتے ہیں۔

احکامِ شرعیہ میں عرف وعادت کے اعتبار واستعمال کی جو امثلہ کتبِ فقہ میں ملتی ہیں، ان میں سے بعض کی تفصیل حسبِ ذیل ہے

عبادات میں عرف وعادت کے اطلاقات کا جائزہ

شریعت میں عرف وعادت کے اطلاق کا میدان اس قدر وسیع ہے کہ فقہ کا شاید ہی کوئی باب ایسا ہو جس میں عرف وعادت پر مبنی احکام موجود نہ ہوں۔ حتیٰ کہ عبادات کا باب کہ جہاں احکام زیادہ تر توقیفی ہیں اور اجتہاد کی گنجائش بہت کم ہے، وہاں بھی بعض ایسے مسائل موجود ہیں جن میں عرف وعادت کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً نماز کو عمل یسیر باطل نہیں کرتا۔ نمازی کے لئے اس بات کی اجازت ہے کہ وہ دوران نماز بقدرِ ضرورت عمل یسیر کر سکتا ہے۔ بعض فقہاء نے اس کی حد تین مرتبہ مقرر کی ہے جب کہ دیگر فقہاء کا کہنا ہے کہ نماز کو باطل کر دینے والی حرکت کے لئے ضروری ہے کہ وہ عمل کثیر ہو۔ عمل یسیر یا کثیر کی کوئی مخصوص شکل یا تعداد مقرر نہیں، بلکہ اس کا انحصار عرف پر ہے چنانچہ ابن قدامہ کا کہنا ہے:

"هذا لا توقيف فيه، ولكن يرجع في الكثير واليسير إلى العرف، فيما يعد كثيرا أو يسيرا[16]"

"عمل کثیر کے تعین کے سلسلے میں کوئی بیان نہیں لیکن عمل کثیر اور قلیل میں عرف کی طرف رجوع کیا جائے گا"

جس عمل کو لوگ عمل کثیر کہیں گے (وہ نماز کو باطل کردے گا) اور جسے عرف میں عمل یسیر کہا جائے گا اسے یسیر ہی سمجھا جائے گا

اسی طرح زکوٰۃ کے ضمن میں مسئلہ ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس پانچ اونٹ ہوں تو ان کے بدلے ایک بکری زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ اس سلسلے میں ابن قدامہؒ اپنی رائے پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وتكون الشاة المخرجة كحال الإبل في الجودة والرداءة، فيخرج عن الإبل السمان سمينة، وعن الهزال هزيلة، وعن الكرائم كريمة، وعن اللئام لئيمة[17]"

"بکری اونٹوں کے حسب حال ہو گی یعنی اونٹ اگر فربہ ہوں تو زکوٰۃ میں بکری بھی فربہ دی جائے گی۔ اونٹ اگر کمزور یا متوسط ہوں تو بکری بھی ویسے ہی ہو گی"

ابن عبدالسلامؒ کی رائے ہے کہ بکری کی صحت کا معیار لوگوں کے عرف اور علاقے کے رواج کے مطابق ہو گا[18]۔ اسی طرح زکوٰۃ کے سلسلے میں رواج اور عرف کے اطلاق کے سلسلے میں کہا گیا ہے:

"ويباح للنساء من حلي الذهب والفضة والجواهر كل ما جرت عادتهن بلبسه، مثل السوار والخلخال والقرط والخاتم، وما يلبسنه على وجوههن، وفي أعناقهن، وأيديهن، وأرجلهن، وآذانهن وغيره، فأما ما لم تجر عادتهن بلبسه، كالمنطقة وشبهها من حلي الرجال، فهو محرم، وعليها زكاته، كما لو اتخذ الرجل لنفسه حلي المرأة[19]"

"عورت اپنے رواج اور عرف کے مطابق سونے، چاندی یا جواہرات کے زیورات زیب تن کر سکتی ہے اور زیر استعمال زیورات پر زکوٰۃ واجب نہ ہو گی چاہے اس کی مقدار کتنی ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر کوئی عورت اپنے علاقے یا خاندان کے عرف سے زائد زیورات استعمال کرے گی تو اُس پر زکوٰۃ ہو گی۔"

روزہ اور اس کے احکام میں بھی عرف و عادت کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً رمضان المبارک میں مسافر کس قدر مسافت کرے گا کہ اسے روزہ افطار کرنے کی رخصت ہو گی۔ اس میں چار اسباب وجہات بیان کی جاتی ہیں:

أ. اس کا دار و مدار وقت پر ہو گا جیسا کہ ایک دن کی مسافت یا تین دنوں کی مسافت۔

ب. اس کا دار و مدار مقدارِ سفر پر ہو گا جیسا کہ دس میل یا بیس میل کا سفر۔

ت. اس کا تعلق مسافت کی مشقت پر بھی ہو سکتا ہے۔ اگر سفر پُر مشقت ہو تو مسافر قصر و افطار کی رخصت حاصل کرے گا

ث. چوتھی جہت یہ ہے کہ ہر وہ سفر جسے لغت اور عرف کے اعتبار سے سفر کہا جائے اور سفر کرنے والے شخص کو عرفاً مسافر کہا جائے تو ایسی حالت میں نماز کو قصر اور روزے کو افطار کیا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں مقدارِ سفر اور وقتِ سفر وغیرہ غیر متعلق ہو جائیں گے۔ چنانچہ فقہاء کی رائے ہے کہ اگر کوئی شخص طویل سفر طے کر کے اپنے کسی باغ وغیرہ کی دیکھ بھال کے لئے جائے تو وہ مسافر نہ ہو گا بلکہ مقیم ہی متصور ہو گا۔ کیونکہ لوگ اسے مسافر نہیں گردانتے اور وہ خود بھی اپنے آپ کو مسافر نہیں خیال کرتا۔ بصورتِ دیگر مسافر کے احکام لاگو ہوں گے جیسا کہ اہل مکہ نے حج کے موقع پر عرفات کے سفر میں قصر کیا[20]۔

عبادات کے ہی ضمن میں حج کا معاملہ بھی ہے۔ حج کی فرضیت کے لئے ضروری ہے کہ حاجی کے لئے بیت اللہ کا سفر کرنا

ممکن ہو۔اس امکان کا تعلق بھی عرف وعادت پر مبنی ہو گا۔اگر کوئی شخص عام مروجہ طریقے سے سفر کر کے حج کو نہ پا سکتا ہو۔اور وہ اپنے آپ کو لوگوں کی عادت کے بر خلاف تکلیف میں مبتلا کر کے سفر کرنے سے ہی حج کو پانا ممکن ہو تو حج کی سعی لازم نہ ہو گی۔

ابن قدامہؒ حج کے استطاعت کے بارے میں عرف کے اطلاق کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"وإمكان المسير معتبر بما جرت به العادة، فلو أمكنه المسير بأن يحمل على نفسه ويسير سيرا يجاوز العادة، أو يعجز عن تحصيل آلة السفر، لم يلزمه السعي [21]"

مذکورہ عبارت کا مفہوم ہے کہ اگر لوگوں کے عرف وعادت سے بڑھ کر مشقت کرنے سے ہی حج کرنا ممکن ہو تو حج کی کوشش کرنا لازم نہ ہو گا گویا حج کے سفر کے لزوم کے لئے ضروری ہے کہ مروجہ اور معروف طریقے سے حج کو پانا ممکن ہو اور عرف وعادت سے ہٹے ہوئے طریقے سے مشقت اُٹھا کر حج کرنا لازم نہ ہو گا۔

معاملات میں عرف وعادت کے اطلاقات کا جائزہ

علم فقہ کا اطلاق چونکہ دین اور دنیا دونوں پر ہوتا ہے اس لئے مسائل فقہ کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

1. عبادات: جو امور عام طور پر روحانیت اور آخرت سے متعلق ہیں جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ۔عرف وعادت کے اعتبار سے اس پر بحث اوپر گزر چکی ہے۔
2. معاملات: احکام کی دوسری قسم معاملات کی ہے جس میں تین طرح کے معاملات (عقوبات، مناکحات اور معاہدات) شامل ہیں، ان سب میں عرف وعادت کے اطلاق کی مثالیں ملتی ہیں تاہم وضاحت کے لیے اس جگہ مالی معاہدات پر زیادہ بحث ہو گی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مالی امور اور ان سے متعلقہ معاہدات جیسے بیع و شراء، ٹھیکہ، امانت، ضمانت، ہنڈی، شرکت، ناجائز قبضہ، اتلافِ مال وغیرہ میں عرف وعادت کے اعتبار کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔مثال کے طور پر عقد بیع مالی معاملات میں سب سے اہم معاملہ ہے۔تمام معاہدات میں یہ سب سے پہلے آتا ہے۔یہ کتب فقہ کے وسیع باب پر مشتمل ہوتا ہے اور انسانوں کی عملی زندگی میں اس عقد کی اہمیت بہت گہری ہے۔فقہاء معاملات کے ابواب کی ابتداء اسی عقد کی بحث سے کرتے ہیں اور وہ تمام متعلقہ قواعد، صیغہ جات، باہمی رضا، حقیقتِ مال اور شرائطِ بیع کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

عقدِ بیع میں عرف وعادت کا اطلاق کثرت سے ہوتا ہے۔عقد بیع میں تعریفات، قواعد، صیغہ جات، شرائط وغیرہ ہر ایک میں عرف وعادت کا استعمال واطلاق نظر آتا ہے۔مثلاً عقد بیع کے انعقاد کے لئے صیغہ جات کا مناسب ہونا ضروری ہے۔اس بارے میں علماء کے دو اقوال ہیں:

1۔ایک قول یہ ہے کہ بیع سوائے مخصوص الفاظ کے منعقد نہیں ہوتی۔

2۔دوسرا قول یہ ہے کہ بیع ہر اُس طریقے اور الفاظ سے منعقد ہو جاتی ہے جسے لوگ عرف میں بیع ہی خیال کرتے ہوں کیونکہ شریعت میں بیع کا لفظ مطلق ہی استعمال ہوا ہے اور اختلاف کی صورت میں عرف سے رجوع کیا جائے گا چنانچہ امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

"اہل مدینہ بیع میں عرف کو ہی معتبر مانتے تھے۔اُن کے نزدیک وہی بیع تھی جسے لوگ بیع خیال کرتے تھے اور جسے لوگ اجارہ کہتے وہ اجارہ ہی تھا اور جسے وہ ہبہ خیال کرتے وہ ہبہ ہی ہوتا تھا[22]۔"

اسی طرح جب کسی شخص نے کسی دوسرے سے کوئی گھر خریدا تو عرف کے مطابق اس سودے میں گھر کی بنیادیں اور درخت وغیرہ بھی شامل ہوں گے۔ امام عزالدین بن عبدالسلام لکھتے ہیں:

وإن لم يصرح بذلك للعرف الجاري بين الناس في أن مثله الأشياء تدخل في عقد البيع تبعا للدار[23]"

"اگرچہ مکان کی خرید وفروخت میں اس بات کی تصریح نہ بھی کی گئی ہو پھر بھی یہ چیزیں مکان کے سودے میں شامل ہوں گی کیونکہ معاملات میں لوگوں میں ایسا ہی عرف پایا جاتا ہے۔"

کسی عقد بیع کے درست ہونے کے لے یہ بھی ضروری ہے کہ فریقین نے ایجاب وقبول کیا ہو۔ اس کے لئے دونوں کے درمیان عقد بیع کے لئے باہمی رضامندی ضروری ہے۔ نیز ایجاب وقبول کے درمیان مناسب وقفہ ہونا چاہئے اور مناسب وقفہ وہ ہوگا جو لوگوں کے عرف کے مطابق ہوا گر یہ وقفہ عرف وعادت کے مطابق ہے تو عقد بیع منعقد ہو جائے گا ورنہ نہیں[24]۔

بیع کے ارکان وشرائط مکمل ہونے پر وہ منعقد ہو جاتی ہے۔ تاہم شریعت کسی عقد میں صرف الفاظ وشرائط کو ہی معیار نہیں سمجھتی بلکہ عدل وحکمت کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔ بیع میں ارکان وشرائط کے مکمل ہونے کے بعد بھی اگر عقد بیع میں کوئی نقص، غبن یا جعل سازی ثابت ہو جائے تو عاقدین کو بیع فسخ کرنے کا اختیار ہوتا ہے تاکہ کسی فریق کا نقصان نہ ہو۔ دفع مضرت کے لئے عاقدین کو مندرجہ ذیل اختیارات حاصل ہوتے ہیں:

خیار مجلس خیارِ شرط خیار غبن خیار تدلیس خیار عیب

ان میں سے بعض وہ ہیں جن کا تعلق عاقدین کے مصالح سے ہے اور بعض وہ جن کا تعلق عاقدین کے ارادے سے ہے۔

امام ابن قدامہ فرماتے ہیں:

"والمرجع في التفرق إلى عرف الناس وعادتهم فيما يعدونه تفرقا، لأن الشارع علّق عليه حكما ولم يبينه، فدل ذلك على أنه أراد ما يعرفه الناس[25]"

"عاقدین کی علیحدگی کی بنیاد لوگوں کا عرف وعادت ہے جسے وہ علیحدگی گردانیں گے وہی علیحدگی ہوگی کیونکہ شارع نے اس حکم کی تشریح نہیں فرمائی جو اس بات کی دلیل ہے کہ شارع کا ارادہ وہی تھا جو لوگوں کے عرف کے مطابق ہو"

خیارِ غبن میں بھی اسی طرح کی بحث ملتی ہے۔ غبن سے مراد بیع میں دھوکہ دہی ہے۔ فقہاء کے نزدیک غبن سے مراد یہ ہوتا ہے کہ جب قیمت اور چیز ایک دوسرے کے صحیح متبادل نہ ہوں تو غبن ہوگا۔ یعنی قیمت کا مبیع کی حیثیت سے کم یا زیادہ ہونا۔ ایسی صورت میں عاقدین میں سے کسی کو بیع فسخ کرنے کا اختیار ہوگا تاہم یہ سہولت بھی لوگوں کے عرف وعادت سے تجاوز نہیں کرے گی۔ ایسا صرف اسی صورت میں ہوگا جس میں لوگوں کی عادت موجود ہے ورنہ خیار غبن درست نہ ہوگا[26]

خیار تدلیس میں بھی عرف وعادت کا اطلاق موجود ہے۔ تدلیس کا معنی کسی عیب کو چھپانا ہے۔ فقہی اعتبار سے تدلیس کی دو قسمیں ہوتی ہیں:

(۱) کسی عیب کو چھپانا۔ (۲) کوئی ایسا فعل کرنا جس سے چیز کی قیمت بڑھ جائے اگرچہ عیب نہ ہو[27]۔ حدیث میں ہے:

"روى أبوهريرة أن رسول الله مرّ على صبرة طعام، فأدخل يده فيها فنالت أصابعه بللا فقال: ما هذا يا

صاحب الطعام؟ قال: أصابت السماء يا رسول الله قال: أفلا جعلته فوق الطعام حتى يراه الناس، ثم قال: من غش فليس منّي[28]"

"حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ کا گزر غلے کے ڈھیر سے ہوا۔ آپ ﷺ نے اس کے اندر اپنا ہاتھ ڈالا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیاں گیلی ہو گئیں۔ آپ ﷺ نے غلے والے سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ اس پر بارش ہو گئی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم اسے اوپر نہیں کر سکتے تھے تاکہ لوگ دیکھ سکتے! پھر فرمایا کہ "جس نے ملاوٹ کی اُس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔"

چنانچہ ایسی صورت میں کہ جب بیع میں تدلیس یا ملاوٹ پائی جائے اور خریدار کو اُس سے آگاہ نہ کیا جائے تو بیع کو فسخ کیا جانے کا حق موجود رہتا ہے۔ تاہم یہ بھی لوگوں کے عرف وعادت کے مطابق ہو گا۔ ایسے فعل کے ناجائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں البتہ فسخ بیع عرف وعادت کے مطابق ہو گا چنانچہ کہا گیا ہے[29]۔

ایک مسلمان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے قول و فعل میں سچا اور کھرا ہو، وہ نہ صرف اپنی ذات کا خیر خواہ ہوتا ہے بلکہ دوسروں کے لئے بھی بہتر ہی سوچے گا۔ خرید وفروخت کے معاملات میں بھی وہ ایمانداری کو برقرار رکھے گا۔ آپ کا ارشاد ہے

"فإن صدقا وبيّنا بورک لهما في بيعهما، وإن كتما وكذبا محقت بركة بيعهما[30]"

"اگر دونوں (بائع اور مشتری) نے سچ بولا اور کھول کر بیان کر دیا تو اُن کی بیع میں برکت ہو گی اور اگر اُنہوں نے کچھ چھپایا یا جھوٹ بولا تو اُن کی بیع سے برکت اُٹھ جائے گی۔"

بیع کے معاملہ میں اصل تو یہی ہے کہ چیز اور اُس کی قیمت ایک دوسرے کا صحیح متبادل ہوں۔ اُن میں کسی قسم کا دھوکہ، فریب اور جھوٹ یا عیب نہ ہوں۔ تاجروں کے عرف کے مطابق اگر عیب پایا جائے تو عرف وعادت کے مطابق بیع کو فسخ کرنے یا برقرار رکھنے کا اختیار ہو گا تاہم اگر عیب ظاہر ہونے کے بعد مشتری کے کسی قول و فعل سے اُس کی رضا ظاہر ہو جائے تو بیع درست ہو گی۔

عرف وعادت کے اعتبار کی مثالیں اجارہ میں بھی کثرت سے ملتی ہیں۔ کسی عوض کے مقابل کسی چیز کے منافع کو فروخت کرنے کے عقد کو اجارہ کہا جاتا ہے۔ تمام ادوار کے اہل علم وفقہاء اجارہ کے جواز کے قائل رہے ہیں کیونکہ ہر کسی کے لئے ممکن نہیں کہ وہ ہر چیز کا مالک ہو مثلاً ہر کسی کے پاس مکان نہیں ہوتا نہ ہی ہر کسی کے پاس اپنی سواری ہوتی ہے لہذا لوگوں کی سہولت اِس میں ہے کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق اشیاء کو اجارہ پر حاصل کریں۔ اجارہ بیع کی اقسام میں سے ہی ایک قسم ہے جسے بیع المنافع بھی کہا جاتا ہے[31]۔

عقدِ اجارہ کے انعقاد کے الفاظ کا اعتبار عرف پر مبنی ہے۔ جس طریقہ اور جن الفاظ کے ساتھ لوگ عقد اجارہ کرتے ہوں وہی معتبر ہو گا۔ امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

"فأي لفظ من الألفاظ عرف به المتعاقدان مقصودهما انعقد به العقد[32]"

"کوئی بھی ایسا لفظ جس کا مقصود فریقین سمجھتے ہوں، اُس سے عقد منعقد ہو جائے گا۔"

یعنی اجارہ کسی بھی ایسے لفظ سے منعقد ہو جائے گا جو اجارہ کے لئے مستعمل ہوتا ہو اور عاقدین کی لغت میں واضح ہو اور اُن

کے عرف کے مطابق ہو۔ امام ابن تیمیہؒ مزید فرماتے ہیں:

"إن اسم البيع والإجارة و الهبة في هذا الباب لم يحدها الشارع، ولالها حدّ في اللغة، بل يتنوع ذلك بحسب عادات الناس وعرفهم فما عدوه بيعاً فهو بيع، وما عدوه هبة فهو هبة، و ما عدوه إجارة فهو إجارة ... وهذا أشبه بالكتاب والسنة و أعدل[33]"

" شارع اور لغت نے بیع، اجارہ اور ہبہ کی اس ضمن میں کوئی متعین حد بندی نہیں کی بلکہ یہ چیزیں لوگوں کے عرف و عادات کے مطابق متعین ہوتی ہیں، جسے لوگ بیع شمار کریں وہی بیع ہو گی اور جسے لوگ ہبہ کہیں وہ ہبہ ہو گا اور جسے اجارہ کہیں وہ اجارہ ہے۔ یہی کتاب وسنت کے قریب تر اور عدل کے مطابق ہے"

عادل بن عبد القادر لکھتے ہیں:

"إن الإجارة تنعقد بكل ما يدّل على الرضا عرفا بين العاقدين و يكون واضح الدلالة عليها، وما عده الناس إجارة فهو إجارة[34]"

"بے شک اجارہ ہر اُس لفظ سے منعقد ہو جاتا ہے جو معاہدہ کرنے والوں کے عرف کے مطابق رضا مندی کو ظاہر کرے اور اُس کی دلالت واضح ہو اور لوگ اُسے اجارہ ہی قرار دیتے ہوں"

یہ بات بھی یاد رہے کہ اجارہ میں منافع کا تعین دو باتوں سے ہوتا ہے ایک عرف اور دوسرا وصف مثلاً اگر کسی نے کوئی مکان کرایہ پر لیا تو اُس سے وہ منافع حاصل کرے گا جو عرف کے مطابق ہو۔ اِسی طرح اگر کسی نے کسی مزدور کی خدمت حاصل کی یعنی اس کی خدمات کا اجارہ کیا تو تو اُس سے وہی خدمت لے گا جو عرف کے مطابق ہو اور اگر کوئی سواری کرایہ پر لی تو اُس پر وہی بوجھ لادے گا جو اُس سواری کے وصف اور لوگوں کے عرف کے مطابق ہو۔ عقدِ اجارہ کی مدت میں بھی لوگوں کے عرف و عادت کا اطلاق پایا جاتا ہے مثلاً اگر زمین کے اجارہ کی مدت سو سال رکھی تو عرف کے مطابق درست ہو گا اور گاڑی کے اجارہ کی مدت پچاس سال رکھی تو درست نہ ہو گا[35]۔

عرف کے اعتبار کی ایک عمدہ مثال قرض خواہ کا مقروض سے یا قاضی کا کسی سے ہدیہ وغیرہ لینے کا عمل بھی ہے۔ شرعی اعتبار سے قرض خواہ کا مقروض سے ہدیہ لینا مستحسن اور مناسب نہیں تاہم اگر اُن کے درمیان پہلے سے ایسا کوئی تعلق یا رسم و رواج موجود ہو تو جائز ہو سکتا ہے۔ صاحبِ فتح القدیر لکھتے ہیں:

"ويجب أن يكون هدية المستقرض للمقرض كالهدية للقاضي، إن كان المستقرض له عادة قبل استقراضه فأهدى إلى المقرض فللمقرض أن يقبل منه قدر ما كان يهديه بلا زيادة[36]"

"اور ضروری ہے کہ مقروض کے قرض خواہ کے لئے تحفہ کی حیثیت وہی ہو جو قاضی کے لئے ہوتی ہے۔ اگر اُن کے ہاں پہلے سے تحفہ دینے کی عادت ہو تو قرض خواہ صرف اُسی کے مطابق تحفہ قبول کرے اور اُس سے زائد نہ لے"

کسی انسان کے لئے عملی طور پر یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے تمام معاملات اور ضروریات کو تنہا بذاتِ خود پورا کر سکے۔ کئی قسم کے حوائج و احوال انسان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ دوسروں کی مدد حاصل کرے مثلاً وہ بیمار ہو سکتا ہے، بڑھاپا یا کمزوری لاحق ہو سکتی ہے یا اِسی نوعیت کی کوئی دوسری مجبوری ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے اُسے کسی دوسرے کی مدد درکار ہو۔ ایسے حالات میں وہ

اپنے معاملات یا معاملہ کی ادائیگی کے لیے کسی کو وکیل کر سکتا ہے۔ قرآن مجید میں وکالت کا ثبوت پایا جاتا ہے چنانچہ ارشاد ہے:

"فَابعَثُوا أَحَدَكُم بِوَرِقِكُم هَٰذِهِ إِلَى المَدِينَةِ فَليَنظُر أَيُّهَا أَزكَىٰ طَعَاما فَلياتِكُم بِرِزق مِّنهُ[37]"

"تو اپنے میں سے کسی کو یہ سکّہ (کرنسی) دے کر شہر بھیجو وہ دیکھے کہ نفیس کھانا کون سا ہے تو اُس میں سے کھانے کو لے آئے"

ابن قدامہؒ وکالت کے جواز کے بارے میں فرماتے ہیں:

"أباحها الشرع دفعا للحاجة وتحصيلا لمصلحة[38]"

"وکالت کو شریعت نے حاجت کو پورا کرنے اور مصلحت کے حصول کی غرض سے جائز قرار دیا ہے"

وکالت عام طور پر کسی بھی شعبہ میں ہو سکتی ہے تاہم اُس کے لئے شرعی طور پر یا عرف وعادت کے مطابق اجازت ہونی چاہیے۔ وکیل میں بھی متعلقہ مہارت، صلاحیت اور اہلیت ہونی چاہیے۔

دیگر معاملات اور عقود کی طرح وکالت بھی ایجاب وقبول سے منعقد ہو جاتی ہے۔ موکل ایجاب اور وکیل قبول کرتا ہے اور وکالت کی اجرت طے کی جائے گی لیکن اگر وکیل اور موکل دونوں اجرت کے بارے میں خاموش رہے تو وکیل عرفی یا مثلی اجرت کا مستحق ہو گا[39]۔

یہاں یہ جاننا اہم ہے کہ جب کوئی کسی کو وکیل بنائے اور وہ کسی کو کچھ دینے کو کہنے تو وکیل یہ ادائیگی لوگوں کے رواج اور عرف کے مطابق کرے گا۔ امام بخاری نے اس سے متعلق بخاری شریف میں ایک باب کا عنوان باندھا ہے "إذا وكّل رجل رجلاً أن يعطى شيئاً، ولم يبين كم يعطى فأعطى على ما يتعارفه الناس[40]" "جب کسی شخص نے کسی دوسرے شخص کو یہ کام سونپا کہ اس کو کوئی چیز دے، اور یہ واضح نہ کیا کہ کتنی دے تو وہ لوگوں کے عرف کے مطابق دے گا

وکالت دراصل ولایت ہی کی ایک قسم ہے جو مطلق ہو گی یا مقید ہو گی۔ اگر وکالت مقید ہو تو ظاہر ہے کہ وکیل کا اختیار صرف اُسی قدر ہو گا جس قدر مؤکل نے اُسے دیا ہے اور وکیل اُس سے تجاوز نہیں کرے گا۔ اگر وکالت مطلق ہو تو وکیل کا تصرف بھی مطلق ہو گا البتہ اِس تصرف کی بنیاد تین چیزوں پر ہو گی۔

1. مؤکل کی مصلحت و بہتری
2. عرف وعادت
3. دیگر معقول قرآئن

یعنی مطلق وکالت کی صورت میں بھی وکیل مذکورہ بالا تین چیزوں کی روشنی میں ہی تصرف کرے گا۔ وکالت ایک امانت ہے اور وکیل ایک امین کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا وکیل کے لئے ضروری ہے کہ اُس کے پاس مؤکل کی جو بھی امانت ہو وہ اُسے مکمل دیانت داری اور عرف و عادت کے مطابق ادا کرے۔ وہ اپنے تصرف اور اختیار میں افراط و تفریط نہ کرے۔ اگر وہ اپنے اختیارات کو لوگوں کے عام عرف کے مطابق استعمال کر رہا ہو تو ایسی صورت میں اگر اُس کے ہاتھ سے مؤکل کے کسی مال و جائیداد وغیرہ کا نقصان بھی ہو جائے تو اُس پر تاوان نہ ہو گا لیکن اگر وہ اپنی حدود سے تجاوز کرے اور کوئی نقصان ہو جائے تو وکیل

پر تاوان ہو گا۔ بہر حال ضروری ہے کہ وکیل اپنے فرائض واختیارات عرف وعادت کے مطابق استعمال کرے[41]۔

تجارت وزراعت کی بہت سی صورتوں مثلاً مشارکت، مساقات اور زراعت وغیرہ میں بھی عرف وعادت کے اطلاق کی مثالیں ملتی ہیں۔ شراکت میں عموماً دو یا زائد افراد کسی کاروبار یا کمپنی میں استحقاق اور تصرف میں شریک ہوتے ہیں جب کہ مساقات میں درختوں کے کچھ پھلوں کے عوض درختوں کا باغ دکھ بھال کے لئے کسی کو دینے کا معاہدہ ہے۔ مزارعت زرعی اراضی کے مالک اور کاشتکار کے درمیان معاہدہ ہوتا ہے کہ پیداوار میں اتنا حصہ مالک اور اتنا حصہ کاشت کار کو ملے گا یعنی بٹائی پر زمین کاشت کرنے کے لئے دینا۔ کاروبار اور تجارت کی یہ تمام صورتیں کتاب، سنت اور اجماع کی روشنی میں جائز ہیں، قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"إِنَّ كَثِيرا مِّنَ الخُلَطَاءِ لَيَبغِي بَعضُهُم عَلَىٰ بَعضٍ إِلَّا الَّذِينَ أَمَنُواْ وَعَمِلُواْ الصَّٰلِحَٰتِ وَقَلِيل مَّا هُم[42]"

"اور اکثر شریک ایک دوسرے پر زیادتی ہی کرتے ہیں ہاں جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور ایسے لوگ کم ہی ہیں"

اِس آیت میں خلطاء سے مراد شرکاء ہیں۔ یہاں شراکت کا جواز ملتا ہے اور شراکت میں ظلم وزیادتی کی ممانعت ہے۔ حدیث میں ہے;

"عن أبی هريرة أن رسول الله قال: يقول الله تعالى: أنا ثالث الشريكين مالم يخن أحدهما صاحبه، فإذا خان أحدهما صاحبه خرجت من بينهما[43]"

"حضرت ابو یرہرہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اُس وقت تک دو شریکوں میں تیسرا ہوں جب تک وہ ایک دوسرے سے خیانت نہ کریں۔ جب ایک نے دوسرے سے خیانت کی تو میں اُن کے درمیان سے نکل جاتا ہوں"

شراکت میں فریقین کے درمیان جو قواعد وضوابط طے ہوں اُس کے مطابق عمل کیا جائے گا تاہم اگر کوئی ایسا کام کر دیا جائے جو طے شدہ اصولوں اور شرائط کے مطابق نہ ہو تو بھی اگر وہ تاجروں اور کاروباری لوگوں کے عرف کے مطابق ہو تو جائز ہو گا۔ مساقات اور مزارعت میں بھی اُن تمام روایات اور عادات کی پابندی کی جائے گی جو کسانوں اور مزارعوں کے درمیان رائج ہوں جو قیود وشرائط اِس سلسلہ میں لازمی ہیں اُن کے بارے میں کہا جاتا ہے:

"وهذايشمل جميع العمليات الزراعية التی يجری بهماالعرف الزراعی، وعوائد الفلاحين والمزارعين فی المساقاة والمزارعة[44]"

"یہ قواعد وضوابط اُن تمام زرعی معاملات پر مشتمل ہوں گے جو کسانوں اور کاشت کاروں میں مساقات اور مزارعت کے عرف وعادت کے مطابق ہوں"

اِس ضمن میں چند قواعد کا ذکر بھی ضروری ہے جن کی بنیاد عرف وعادت پر ہے:

"المعروف بين التجار كالمشروط بينهم[45]"

"تاجروں کے درمیان جو معروف ہو وہ ایسے ہی ہے جیسے کہ اُن کے درمیان مشروط ہو"

یعنی کسی علاقے کی کاروباری عادت ورواج کو ایسا سمجھا جائے گا جیسا کہ کسی معاملے میں عاقدین باہم رضامندی سے کوئی درست شرط طے کریں تو جس طرح اس شرط کی پابندی دونوں عاقدین کے لیے ضروری ہو جاتی ہے اسی طرح کسی علاقے کی کاروباری و تجارتی عرف کی پابندی بھی بمنزلہ شرط کے قرار دی جائے گی اور اس کی پابندی ضروری ہو گی۔ فقہ حنبلی کا قاعدہ ملاحظہ ہو:

"ليس لأحد من الشركاء عمل ما ليس من التجارة المقصودة بالشركة أو يضربها أو يمنع الشرع منها[46]".

"کسی شریک کے لئے جائز نہیں کہ وہ کوئی ایسا عمل کرے جو شرکت یا اُس قسم کی دیگر تجارت کے اصولوں کے خلاف ہو یا شریعت نے اُس سے منع کر رکھا ہو۔"

چند الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ اِسی قاعدہ کو یوں بھی بیان کیا جاتا ہے:

"لكل واحد من الشركاء أن يعمل كل ما هو من أعمال التجار وعوائدهم[47]"

"ہر شریک کے لئے ضروری ہے کہ وہ وہی عمل کرے جو تاجروں کے عام طریقوں اور اُن کی عادات کے مطابق ہو"

حقیقت یہ ہے کہ عقود میں عرف وعادت کا اعتبار بہت بڑی بنیاد ہے۔ جیسا کہ اِس بارے میں عبد الرحمن نے رائے دی ہے;

"والعرف أصل كبير، يرجع إليه فى كثير من الشروط والحقوق لم تتقدر شرعاً ولا لفظا[48]"

"عقود میں عرف بہت بڑی بنیاد ہے۔ بہت سے ایسے شروط اور حقوق جو شرعی ولفظی اعتبار سے متعین نہ ہوں، عرف کی طرف لوٹتے ہیں"

امام ابن تیمیہؒ بھی یہی رائے رکھتے ہیں کہ عقود میں جب کبھی بھی کوئی اختلاف وغیرہ ہو یا حقوق وشرائط کا مسئلہ ہو تو عرف ہی اصل بنیاد ٹھہرتی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"العقد المطلق يحمل على عرف الناس و عاداتهم[49]"

"مطلق عقد کا دار ومدار لوگوں کے عرف اور اُن کی عادات پر ہوتا ہے۔"

الغرض عرف وعادت ایک اہم مأخذ شریعت ہے اور اس کا اعتبار واطلاق ہر قوم کے اُصولِ قانون میں پایا جاتا ہے۔ فقہ اسلامی بھی بہت سے احکامِ شرعیہ میں عرف وعادت کی رعایت کرتی ہے بالخصوص عائلی اور مالی معاملات میں عرف و عادت کا اطلاق جابجا ملتا ہے۔

نتائجِ بحث

شریعت اسلامی اپنے مآخذ اور ان کی ترتیب کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ قرآن، سنت، اجماع وقیاس اسلامی شریعت کے بنیادی مآخذ ہیں تاہم ثانوی مآخذ میں عرف وعادت کو بڑی وقعت دی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عادت وعرف یا رسم ورواج کو ہمیشہ سے قانون سازی میں قابل ذکر حیثیت دی گئی ہے۔ فقہ اسلامی کے سرمایہ میں اگر عبادات و معاملات میں اگر عادت و عرف کے اطلاقات کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں وسیع پیمانہ پر جزئیات ملتی ہیں اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ موجودہ دور میں بھی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں امت مسلمہ کی سہولت کے لیے عادت وعرف کو اس کے حسبِ حال قرار حیثیت دی جائے۔

حواشی وحوالہ جات

1 الإصفہانی، حسین محمد الراغب، المفردات فی غریب القرآن: ۲۴۳، دار احیاء التراث العربی، ۱۴۱۲ھ

2 ابنِ منظور، جمال الدین محمد بن مکرم، لسان العرب ۹: ۲۳۹، دار صادر، بیروت، ۱۴۱۴ھ

3 المفردات فی غریب القرآن: ۳۴۴

4 ابن عابدین، محمد امین آفندی، مجموعۃ رسائل ابن عابدین ۲: ۱۴، سہیل اکیڈمی لاہور (س۔ن)

5 الجرجانی، علی بن احمد بن محمد، کتاب التعریفات: ۱۳۰، دار الکتاب العربی بیروت، ۱۴۲۳ھ

6 ابو سنہ، احمد فہمی، العرف والعادۃ فی رأی الفقہاء: ۸، مطبعۃ الازہر (س۔ن)

7 خلاف، عبدالوہاب، مصادر التشریع الاسلامی فیما لا نص فیہ ۲: ۱۴۵، الدار الکویتیۃ (س۔ن)

8 البخاری، عبدالعزیز، کشف الأسرار عن اصول فخر الاسلام البزدوی ۲: ۴۱۵، دار الکتب العربی بیروت، ۱۳۰۸ھ

9 مصطفی الزرقا، الأستاد، المدخل الفقہی العام ۲: ۸۴۳، دار الفکر، بیروت، ۱۹۶۸ء

10 سورۃ الأعراف ۷: ۱۹۹

11 الرازی، فخر الدین، الإمام، مفاتیح الغیب ۱: ۶۶، دار الکتب المصریۃ (س۔ن)

12 الشیبانی، ابو عبداللہ محمد بن حسن، الموطأ: ۱۴۰، ایچ ایم سعید اینڈ کمپنی، کراچی (س۔ن)

اِس حدیث کے مرفوع ہونے کی کوئی دلیل نہیں بلکہ اِس کے بارے میں تحقیق یہ ہے کہ یہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے موقوف ہے۔ ابو داؤد طیالسی نے اپنی مسند ۱: ۳۳ میں، امام حاکم نے اپنی مستدرک کتاب معرفۃ الصحابہ ۳: ۷۸ میں اور حافظ سخاوی نے اپنی المقاصد الحسنہ میں اِسے موقوف حسن بیان فرمایا ہے۔

13 ابن نجیم، الشیخ زین بن ابراہیم بن محمد، الأشباہ والنظائر: ۹۳، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی (س۔ن)

14 الکمال ابن ہمام، شرح فتح القدیر ۱: ۲۱۴، مکتبۃ مصطفی محمد (س۔ن)

15 فقہ اسلامی کے بنیادی مآخذ کی تحقیقی تفصیلی بحث کے لئے ملاحظہ ہو: مولانا محمد تقی امینی، فقہ اسلامی کی تاریخ اور اصولِ فقہ، باب سوم: فقہ اسلامی کے مآخذ: ۵۷، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ستمبر ۱۹۹۱ء

16 ابن قدامہ، ابو محمد عبداللہ بن احمد، المغنی ۲: ۱۸۳، مکتبہ القاہرۃ، ۱۳۸۸ھ/۱۹۶۸ء

17 نفس مصدر ۲: ۴۳۲

18 المغنی ۲: ۱۸۳

19 نفس مصدر ۳: ۴۵

20 مزید مثالوں کے لیے دیکھیے: المغنی ۲: ۱۸۸۔۔۔ابن تیمیہ، تقی الدین احمد بن عبدالحلیم، مجموع الفتاوٰی ۱۹: ۲۴۳، بیروت، ۱۴۲۴ھ

21 المغنی ۳: ۲۱۴

22 مجموع الفتاوٰی ۲: ۳۴۵

23 عزالدین بن عبدالسلام، قواعد الأحکام فی مصالح الأنام ۲: ۱۱۴، دار الجیل، ۱۴۰۰ھ

24 نفس مصدر

25 المغنی ۶: ۱۲

26 المدخل الفقہی العام ۱: ۳۷۸

27 نفس مصدر

28 النیسابوری، مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشیری، صحیح مسلم، کتاب الایمان ۲: ۱۰۸، دار إحیاء التراث العربی - بیروت، ۱۴۲۲ھ

29 المغنی ۶: ۲۲۳

30 متفق علیہ صحیح البخاری ۴: ۳۰۹۔۔۔ صحیح مسلم مع شرح النووی ۱۰: ۱۷۵

31 اجارہ کے متعلقہ مباحث کے لیے ملاحظہ ہو: خالد سیف اللہ رحمانی، قاموس الفقہ ۱: ۴۹۱، زمزم پبلشرز، اردو بازار کراچی، اگست ۲۰۰۷ء

32 مجموع الفتاوی ۲۰: ۵۳۳

33 نفس مصدر ۲۰: ۳۴۵

34 عادل بن عبد القادر بن محمد ولی قوتہ، العرف حجیتہ واثرہ فی فقہ المعاملات المالیۃ عند الحنابلۃ (دراسۃ نظریۃ تاصیلیۃ تطبیقیۃ) ۲: ۵۶۳، طبعۃ المکتبۃ المکیۃ، ۱۴۱۸ھ

35 نفس مصدر

36 فتح القدیر ۷: ۲۷۲

37 سورۃ الکہف ۱۸: ۱۹

38 المغنی ۷: ۱۹۷

39 مجموع الفتاوی ۳۰: ۶۷

40 البخاری، أبو عبد اللہ محمد بن أسماعیل، صحیح البخاری ۳: ۱۰۰، دار طوق النجاۃ، ۱۴۲۲ھ

41 وکالت اور اس کے متعلقہ مباحث کے لیے ملاحظہ ہو: قاموس الفقہ ۵: ۳۰۹ ومابعد

42 سورۃ ص ۳۸: ۲۴

43 امام أبو داؤد، سلیمان بن أشعث، سنن أبو داؤد، کتاب البیوع، باب الشرکۃ، حدیث (۳۳۸۳) المکتبہ العصریہ، صیدا-بیروت (س۔ن)

44 العرف وحجیتہ واثرہ فی الفقہ المعاملات المالیۃ ۲: ۱۰۲۲

45 لجنۃ مکونۃ من عدۃ علماء وفقہاء فی الخلافۃ العثمانیۃ، المجلۃ الأحکام العدلیۃ، دفعہ ۴۳، نور محمد، کارخانہ تجارتِ کتب، آرام باغ، کراچی (س۔ن)

46 أحمد بن عبد اللہ القاری، المجلۃ الحنبلیۃ فی المعاملات الشرعیۃ، مادۃ ۱۸۴۱، مطبع وسن اشاعت نامعلوم

47 نفس مصدر، مادہ ۱۸۳۸

48 الشیخ عبد الرحمن السعدی، المختارات الجلیۃ: ۵، بیروت، دار المعرفۃ، ۱۴۱۰ھ

49 مجموع الفتاوی ۱۹: ۲۳۵